Oriental College Magazine, Vol.101, No. 03, Serial No. 381, 2025

جنھیں صدیوں نہ بھولے گا زمانہ

(ناصر کاظمی: انتظار حسین کی تحریروں اور مکالموں کی روشنی میں)

مشتاق احمد خان

لیکچرار اُردو، ادارہ زبان وادبیاتِ اردو، پنجاب یونیورسٹی، لاہور

Jinhen sadiyon na bhooly ga zamana

(Nasir Kazmi: In the Light of Intizar Husain's Writings and Conversations)"

Mushtaq Ahmad Khan
Lecturer in Urdu
IULL, University of the Punjab, Lahore

Abstract

Intizar Hussain is known in the world of Urdu literature as a prominent short story writer, novelist, columnist, translator and critic.Like so many other literary figures he also came from India after Partition, here in Lahore he was introduced to Nasir kazmi. A bond of friendship flourished between the two great literary figures. Intizar Hussain was very impressed by Nasir kazmi's enchanting personality as well as his adorable poetry; this is why in his memoir, autobiography and columns, he openly expresses multi-dimensional personalityof Nasir Kazmi. He also wrote several essays on Nasir's art. Furthermore both of them were engaged in mind blowing conversation on different subjects. In this article great attention is focused only on those aspects of Nasir kazmi's personality and art that are reflected in intizar Hussain's writing and conversations.

Keywords:
Intizar Hussain, Urdu literature, Novelist, Columnist, Nasir Kazmi, Multi-dimensional, Lahore

ناصر کاظمی ۸ دسمبر ۱۹۲۵ء کو محلہ قاضی واڑہ (انبالہ شہر) میں پیدا ہوئے۔ انتظار حسین بمطابق قومی شناختی کارڈ ۲۱ دسمبر ۱۹۲۵ء کو ضلع بلند شہر کے مقام ڈبائی میں پیدا ہوئے۔ تقسیم ہندوستان کے وقت دونوں شعوری بلوغت کو پہنچ چکے تھے اور وہاں سے ہجرت کر کے لاہور کو انھوں نے اپنا مسکن بنایا۔ تقسیم کے وقت ہجرت کر کے آنے سے قبل لکھنے کا نہ صرف آغاز کر چکے تھے بلکہ ناصر کاظمی تو اپنے پہلے مجموعے (برگِ نے) کی شروع کی غزلیں کہہ چکے تھے۔ دونوں ادیبوں کی پہلی ملاقات لاہور میں ہوئی اور پھر اس کے بعد ملاقاتوں، مکالموں، بحث مباحثوں کا سلسلہ چل نکلا جن کا آئندہ کے صفحات میں تذکرہ کیا گیا ہے۔

اس مضمون میں میرا موضوع وہ تحریریں ہیں جو انتظار حسین نے ناصر کاظمی کی شخصیت اور فن پر لکھیں اور اس کے علاوہ وہ مکالمے بھی میرے مطالعے کا حصہ ہیں۔ جو ان دونوں کے درمیان مختلف موضوعات پر الگ الگ نشستوں میں ہوئے۔ ناصر کاظمی کی شخصیت اور فن پر لکھی گئی تحریروں کا مطالعہ کریں تو ہم ان کے اسیر ہوتے جاتے ہیں۔ ان کی شخصیت کی جادوگری میں انتظار حسین جیسے لکھاری کا بہت بنیادی کردار ہے۔ جنھوں نے ان کی پہلو دار شخصیت کو ہر زاویے سے دیکھا اور پھر اسے پوری دیانت دار کے ساتھ پیش کر دیا۔ قاری ان کا لکھا پڑھتا جاتا ہے اور اس پر خوش گوار حیرت کے در کھلتے جاتے ہے۔ انتظار حسین کی تحریر میں ایسی جادوگری ہے کہ وہ قاری کو اغوا کر کے ماضی کی دنیا میں لے جاتے ہیں۔ وہ انھیں پڑھتے ہوئے اس دور میں جینے لگتا ہے جس کا ذکر ہو رہا ہوتا ہے۔

انتظار حسین افسانہ نگار، ناول نگار، کالم نگار اور مضمون نگار ہیں۔ انھوں نے داستانوی ادب کو ترتیب دیا اور ترتیب و تدوین سے بڑھ اس کا مطالعہ کیا۔ داستانوں کو اپنے اندر رچایا بسایا۔ انھیں اپنے قلم پر ایسی گرفت ہے کہ ان کی تحریر اپنے پڑھنے والے کو تخیلی اور ماضی کی معطر فضا میں لے جاتی ہے لیکن ناصر کاظمی کے معاملے میں انھوں نے تخیل سے کام نہیں لیا بلکہ اپنے مشاہدے کو کام میں لاتے ہوئے مکمل دیانت داری کے ساتھ لکھا۔ یہ ناصر کاظمی کی خوش بختی ہے کہ انھیں انتظار حسین جیسا لکھنے والا میسر آیا جنھوں نے ان کی زندگی اور فن کے ہر پہلو کو دیانت داری سے بیان کیا۔

تقسیم ہندوستان نے کئی اہل ذوق کو لاہور میں اکٹھا کر دیا جو تقسیم سے قبل ہندوستان کے مختلف شہروں کے مکین تھے۔ انتظار حسین اور ناصر کاظمی بھی تقسیم کے بعد لاہور آ کر آباد ہوئے۔ دونوں کے پہلی ملاقات بھی عجیب غریب تھی کہ ایک دوسرے سے بے نیاز اور بے تعلق بیٹھے رہے۔ یہ ملاقات ۱۹۴۸ء کے اواخر میں ہوئی جب ناصر کاظمی محمد حسن عسکری سے ملنے کے لیے ان کے دفتر آئے۔ حسن عسکری انتظار

حسین کو ناصر کاظمی کا حلیہ بتا کر دفتر سے باہر گئے۔ ناصر کاظمی آ کر بیٹھے محمد حسن عسکری کا انتظار کرنے لگے۔ ان کے آنے پر تینوں کیفے پہنچے۔ انتظار حسین کی بے نیازی اور بے تعلقی نیاز مندی اور گہرے تعلق میں بدلنے لگی جب انھوں نے ناصر کاظمی کا کلام سنا۔ انھیں احساس ہوا کہ وہ ایک نئے شاعر سے متعارف ہوئے بلکہ حسن عسکری جو 'جھلکیاں' کے نام سے کالم لکھتے اور پاکستانی ادب کا ڈول ڈالا ہوئے تھے انھیں ایک دم لگا کہ پاکستان کو ایک شاعر میسر آ گیا۔

> "۱۹۴۸ء کے اواخر کی بات ہے۔ عسکری صاحب گزرتے گزرتے نظام کے دفتر میں آ کر مجھ سے کہہ گئے کہ پانچ بجے ایک صاحب آئیں گے، ناصر کاظمی ان کا نام ہے، مجھے آنے میں دیر ہو جائے تو انھیں بٹھا لینا۔ میں نے بے تعلقی سے یہ سنا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔ بتائے ہوئے وقت پر ایک نوجوان آیا، سانولی رنگت، چھریرا بدن، کالی اچکن عسکری صاحب کو پوچھا۔ میں نے کہا کہ بیٹھ جایئے، آتے ہوں گے۔ اس کے بعد وہ شخص بے پروائی سے سگریٹ پیتا رہا، میں بے تعلق بیٹھا اپنا کام کرتا رہا۔ عسکری صاحب آئے تو ہم تینوں اُٹھ کر کیفے اورینٹ میں، جو اب معدوم ہو چکا ہے، جا بیٹھے۔ وہاں ناصر کاظمی نے غزلیں سنانی شروع کیں۔ مجھ پر کچھ ان غزلوں نے اثر کیا، کچھ عسکری صاحب کی بے تحاشا داد نے۔ اب مجھے احساس ہوا کہ آج میں ایک نئے شاعر سے متعارف ہوا ہوں۔
>
> اس نشست میں ناصر نے یہ غزل بھی سنائی تھی :
>
> یہ شب یہ خیال و خواب تیرے کیا پھول کھلے ہیں منہ اندھیرے
>
> جو عسکری صاحب نے عالم فریفتگی میں وہیں نقل کرائی۔ پھر ۱۹۴۹ء کے آغاز کے ساتھ ساتھ یہ غزل "ساقی" میں شائع ہوئی اور ساتھ ہی "جھلکیاں" میں اعلان ہوا کہ پاکستان کو بالآخر ایک شاعر میسر آ گیا ہے۔"(۱)

یہ پہلا موقع تھا جب انتظار حسین ناصر کاظمی کی صلاحیتوں سے نہ صرف واقف ہوئے تھے بلکہ ان کی صلاحیتوں کو تسلیم کرنے لگے تھے اور محمد حسن عسکری کو پاکستانی ادب کے لیے شاعر میسر آنے کی خوشی ہوئی۔ ناصر کے حصے میں بہت محبت آئی۔ انھیں سنا گیا، دیکھا گیا۔ ان پر لکھا گیا۔ ان کا انتظار کیا گیا۔ گورنمنٹ کالج لاہور اور اورینٹل کالج پنجاب یونیورسٹی لاہور کے طالب علم اور خاص طور پر ادب کے دیوانے ناصر کاظمی کے دیوانے ہونے لگے۔ سینئر ادیبوں سے لے کر ادب کے نئے دیوانوں تک سبھی ان کی صحبت میں بیٹھنا پسند کرتے ۔ ان کے دادخواہوں میں مظفر علی سید، احمد مشتاق، شیخ صلاح الدین اور صلاح الدین محمود جیسی عالم شخصیات

بھی شامل ہیں۔ مظفر علی سید کے مداح حسن عسکری اور خود انتظار حسین ہیں۔ حسن عسکری کا بیان دیکھیے۔

"عسکری صاحب ایک روز کہنے لگے کہ یار ایک عجب نوجوان ہے۔ میں مال روڈ سے کسی وقت بھی گزروں وہ کتابیں بغل میں دابے کسی طرف سے آن پہنچتا ہے اور پھر عالمانہ انداز میں ادب پر گفتگو شروع کر دیتا ہے۔"

میرے کان کھڑے ہوئے۔ پوچھا" کیا حلیہ ہے اس کا۔"

"عینک لگاتا ہے۔ کچھ گول مٹول سا ہے۔ بغل میں کتابیں ہوتی ہیں۔"

"میں سمجھ گیا۔ میں نے اعتماد سے کہا "وہ گورنمنٹ کالج کا ایک طالب علم ہے مظفر علی سید۔" یار بہت عالمانہ گفتگو کرتا ہے۔"(۲)

درج شدہ لائنوں میں جن کی علمیت کی تصدیق میں محمد حسن عسکری اور انتظار حسین کا قلم رواں ہے وہ ناصر کاظمی کی شاعری کے اسیر نظر آتے ہیں۔

"آدھی رات ادھر آدھی رات اُدھر گورنمنٹ کالج نیو ہوسٹل کے سامنے فٹ پاتھ پر کھڑے ہو کر مظفر علی سید نے ناصر سے غزل سنی، گریہ کیا اور کھمبے سے سر پھوڑ کر لہولہان ہو گیا"۔(۳)

حفیظ ہوشیار پوری جو غزل کے بلند پایہ شاعر گزرے ہیں۔ جن کا کلام غزل گائیکوں نے بہت گایا۔ ان کے کئی شعر زبان زد عام ہوئے۔ وہ بھی ناصر کاظمی کے مداحوں میں شامل ہیں۔ انتظار حسین رقمطراز ہیں۔

"حفیظ ہوشیار پوری ٹرانسفر ہو کر لاہور آ گئے تھے، لاہور کے ریڈیو سٹیشن کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے۔ لیجئے ناصر کے چاہنے والوں میں ایک نگ کا اور اضافہ ہو گیا"۔(۴)

ناصر کاظمی کو فطرت سے بہت لگاؤ ہے۔ درخت، پرندے، پھول اس کے اپنے ہیں۔ وہ انھیں صرف دیکھتے نہیں بلکہ محسوس بھی کرتے ہیں۔ سبزہ انھیں خوش کرتا ہے اور سبزے کی ویرانی اداس کرتی ہے۔ درختوں پر چلنے والے آرے ان کے دل پر چلتے ہیں۔ خزاں رسیدہ پتوں کا گرنا انھیں تکلیف دیتا ہے۔ اس لیے جب خزاں میں پتے پیلے پڑ کر گرنے لگتے ہیں تو وہ انھیں دیکھنے جاتے ہیں۔ پتوں کو گرتا وہ تماشائی کے طور پر نہیں دیکھتے بلکہ اس بے بس کی طرح دیکھتے ہیں جس کا خزانہ اس کی آنکھوں کے سامنے لٹ رہا ہو اور وہ خالی خالی اداس آنکھوں سے بیٹھا دیکھ رہا ہو۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

"ناصر سے میری ملاقات پت جھڑ کے موسم میں ہوئی تھی۔ وہ دوپہر کا وقت تھا۔ میں نے مال روڈ کے فٹ پاتھ پر چلتے چلتے دیکھا کہ سامنے سے ایک شخص چلا آ رہا ہے، اپنی دھن میں مست، سگریٹ پیتا ہوا۔ نگاہیں آسمان کی طرف اٹھی ہوئیں۔ غور سے دیکھا تو ناصر کاظمی۔

قریب آنے پر علیک سلیک ہوئی۔ میں نے پوچھا" ناصر صاحب! اس وقت کدھر؟ جواب دیا "پتے دیکھنے جارہاہوں۔"

"پتے؟" میں چکرایا۔

ہاں پتے! آج پتے بہت گرے ہیں۔ میں لارنس کی طرف جاکے دیکھوں گا۔ آپ بھی چلیں، کیا مضائقہ ہے۔"

میں ساتھ ہو گیا۔ ناصر نے چلتے چلتے کہا" یہ پت جھڑ کی رُت ہے۔ یہ رُت مجھے بہت خراب کرتی ہے۔ گرتے پتوں کو دیکھ کر میں اداس ہو جاتا ہوں"۔(۵)

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فطرت ان کے ہاں کس قدر اہمیت کی حامل ہے۔ ماحول سے منسوب عوامل ان کے علامتوں میں ڈھل جاتے ہیں تو کہیں استعارے کا روپ دھار لیتے ہیں۔ جیسے اوپر گرتے ہوئے پتوں کا ذکر ہے۔ اب دیکھیے کہ پتوں کو خزاں کے تھپیڑے لگتے ہیں، وہ کمزور پڑ جاتے ہیں۔ ان کی رگوں میں گردش اب کم ہوتے ہوتے ختم ہو جاتی ہے۔ بالآخر وہ پیلے پڑنے کے بعد ہوا کے ایک جھونکے سے گر جاتے ہیں۔ سرسبز پتوں کے پیلے پڑنے سے گرنے تک کے عمل کو دیکھیے اور تقسیم ہندوستان کے وقت دونوں طرف کے مہاجر خاندانوں کی حالت پر غور کیجیے جن کے خاندان کے افراد ان سے بچھڑ گئے، کچھ قتل ہو گئے۔ ان کا مال و متاع لٹ گیا۔ ان کی تہذیب ریزہ ریزہ ہو گئی۔ تہذیب میں افراد کی جڑیں پیوست ہوتی ہیں۔ جب جڑیں کاٹ دی جائیں یا اکھڑ جائیں تو وہ حالت اوران گرنے والے پیلے پتوں میں بہت مماثلت پائی جاتی ہے۔ انتظار حسین کے ساتھ مکالمے کے دوران ایک سوال کے جواب میں ناصر کاظمی کہتے ہیں:

"ناصر: بات یہ ہے کہ باہر کی چیزیں جب اچھی لگتی ہیں جب آدمی کے اندر کچھ زندگی ہو۔ دریا اس شخص کو بہتا دکھائی دیتا ہے جس کے اندر دریا ہو:

میر دریا ہے سنے شعر زبانی اس کی

تو یہ دریا کا احساس تو اندر ٹھاٹھیں مارتا ہے، دریا مزاج۔ اسی طرح سے درخت ہے۔ آپ کو پتا ہے کہ یہیں سے تو دنیا شروع ہوئی۔ سو یہ درخت تو Growth کا Symbol ہے اور میری شاعری کا جزو اعظم ہے۔ درخت، شہر، چاند، پھول، فطرت Romantic چیزیں نہیں ہیں انتظار حسین دراصل یہ ایک بڑی مہذب تہذیب، جسے صدیوں میں انسان نے خون دے دے کر پالا ہے، اس کے استعارے، اس کی زندہ علامتیں ہیں۔ آپ اندازہ کریں جس شہر میں درخت ہوں، پرندے ہوں، کبوتر ہوں، چڑیاں ہوں، آسمان کھلے ہوں وہ کوئی Romance نہیں، Romantic کون کہتا ہے اسے؟ اس کے پیچھے تصور کرو اس معاشرے کا کہ کیسے لوگ بستے ہوں گے جنھوں نے وہ پھول لگائے ہیں، وہ درخت بنائے ہیں۔"(۶)

درج ذیل اقتباس کی آخری لائن سے احساس ابھرتا ہے کہ فطرت ان کے ہاں ماضی کی یاد بن کر ظاہر ہوتی ہے۔ پھولوں اور درختوں کو دیکھ کر ان کا دھیان ان کے لگانے والوں کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ یہاں ناصر کاظمی کی تہذیب اور روایت کے ساتھ جڑت کا پتا چلتا ہے۔ جس کی جڑت تہذیب کے ساتھ گہری ہو اور جس کی جڑیں روایت میں گڑی ہوئی ہوں انھیں فطرت کی کسی بھی طرح کی تباہی ویرانی کے مترادف محسوس ہو گی۔ یہ ویرانی انھیں اداس کرتی ہے۔ سرسوں کے پھول کو اپنا سمجھنے والے کی اداسی کا تہذیب کے ساتھ تعلق درج ذیل اقتباس میں ملاحظہ ہو:

"انتظار: مگر تم نے مجھ سے تو یہ کہا تھا کہ سرسوں کا پھول بس میرا ہم عصر ہے۔

ناصر: "اصل میں سرسوں کا پھول تو ایک... آپ کو پتا ہے سرسوں کا پھول کس چیز کا نام ہے۔ وہ محض بظاہر تو آپ کو ایک پتی سی زرد سی نظر آتی ہے۔ وہ تو ایک موسم، ایک رنگ، ایک تہذیب کا نام ہے۔ وہ پوری تہذیب میری ہم عصر تھی۔ تو سرسوں کے پھول کے ہم عصر کا مطلب ہے کہ سرسوں کے ساتھ جتنی تہذیب اور رنگ اور میلے اور اس کے ساتھ ہرنوں کا چوکڑیں بھرنا اور وہ رنگ کے میلے ہونا اور وہ زرد زرد موسم اور آسمان وزمین میں قوسِ قزح کا اترنا۔ اس سارا..... میرے پورے عصر کی روح تھی اس میں۔ تو میں نے ایک چیز لے لی:

خبر بہار کی لایا ہے کوئی گل پارہ

سرسوں کے پھول سے دکھانا مقصود تھا اس پوری دھرتی کو۔"(۷)

فطرت کی ہلاکت پر ماتم کناں ہونے میں ان کے بچپن کی یادوں کا بھی عمل دخل ہے۔ ایک حساس شخص کو اس کے بچپن کی چیزوں اور یادوں سے علیحدگی دکھ دیتی ہے۔ یہ دکھ ناصر کاظمی کے حصے میں بہت آیا۔ ان کے علاوہ ان کے معاصرین بھی اس کیفیت سے گزرے۔ یہ کیفیت ناصر کاظمی اور ان کے معاصریں میں تقسیم کی وجہ سے درآئی اور پھر ان کے ہاتھ سے وہ دنیا نکل گئی جس کے نشے میں ان کا بچپن گزرا۔ ناصر کاظمی بچپن کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں :

"دنیا میں اب کیا رہ گیا ہے۔۔۔ ۔ تلچھٹ! وہ درخت جن کی چھاؤں میں کھیلتے کھیلتے رات ہو جاتی تھی، کٹ گئے۔ وہ دوپہریاں جن سے دلوں میں حرارت تھی، ٹھنڈی پڑ گئیں۔ وہ پرندے جو منہ اندھیرے جگاتے تھے، خاموش ہو گئے۔ آبادیوں اور فطرت میں فاصلہ نہ تھا۔ موسم ہمارے ساتھی تھے۔ جب آم پکتے تھے تو ان کی خوشبو کی لپٹ رات کو سونے نہ دیتی تھی۔ وہ آزاد بہتی ندیاں نہ جانے کہاں گم ہو گئیں۔ میرا ما تھا تو اسی روز ٹھنکا تھا جب ہمارے شہر میں بجلی لگی تھی۔ دو تین راتیں گلیوں اور بازاروں میں میلہ سا لگا رہا، بڑے

بوڑھے اور بوڑھیاں حیران کہ اب روشنی بھی قید ہو گئی، پروانے ششدر کہ اب چراغ کے سر پر اندھیرا ہو گا۔ اُس دن کے بعد سے تازہ ہوا، کھلی چاندنی اور معطر اندھیروں کا مزہ جاتا رہا۔ پھر کسی خوشبو اور کسی کرن نے راستہ نہیں روکا۔"(۸)

اس اقتباس میں ٹیکنالوجی کی ترقی بھی فطرت کی ہلاکت کا باعث نظر آ رہی ہے۔ ایک بجلی کے آنے سے سہولیات میں تو اضافہ ہوا لیکن اس کے آنے سے فطرت کے حسن، پرانی تہذیب اور مظاہر فطرت کا طلسم بُری طرح ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوا یعنی ایک بجلی فطرت کے کئی مظاہر کی قاتل بنی۔

اوپر درج شدہ تینوں اقتباسات کی روشنی میں دیکھیں تو ناصر کاظمی فطرت کا عاشق نظر آتا ہے جو فطرت کے حسن سے محظوظ ہوتا ہے، مظاہر فطرت سے لذت کشید کرتا ہے۔ جب بچپن کی یادوں سے جڑا اس کا تہذیبی ورثہ تباہ ہوتا ہے تو اس پر ان کا ماتم کہیں سیدھے سادے انداز میں ملتا ہے اور کہیں علامتی لباس اوڑھ لیتا ہے۔ ان کی اداسی گفتگو کے ساتھ ساتھ ان کے شعروں میں بھی در آتی ہے۔ درج شدہ آخری اقتباس جب پڑھا تو میرا ذہن فوراً ان کے شعر کی طرف منتقل ہوا۔

میٹھے تھے جن کے پھل وہ شجر کٹ کٹا گئے ٹھنڈی تھی جس کی چھاؤں وہ دیوار گر گئی (۹)

زمانے کے طور اطوار بدلے۔ درختوں کی تازہ ہوا کے بجائے پنکھوں کی ہوا کھانے کا رواج بڑھا۔ دن کے وقت بھی روشنی بلبوں سے حاصل کی جانے لگی۔ پھول کاغذی بننے لگے۔ چڑیوں کے شور کے بجائے آہنی مشینوں کا شور انسان کے دل و دماغ میں گھسنے لگا تو ناصر کاظمی بڑبڑانے لگے۔

"یہ ہوش اور عقل کا زمانہ ہے۔ بیداری ہماری ہم عصر ہے۔ فطرت تو اُسی طرح ہے، تارے نکلتے ہیں، ٹوٹتے ہیں، آنکھیں جھکاتے ہیں اور ڈوب جاتے ہیں! سورج نکلتا ہے، ناچتا ہے اور پھر اوجھل ہو جاتا ہے۔ درخت اسی طرح بستے اجڑتے رہتے ہیں۔ لیکن موسم بدل گئے ہیں۔ سبزہ لہکتا ہے لیکن شہر کے دھوئیں میں جھلس جاتا ہے۔ پھول کھلتے ہیں لیکن انھیں کوئی نہیں دیکھتا۔ دل اب بھی دھڑکتے ہیں لیکن آہنی مشینوں کے شور میں ان کی آواز کوئی نہیں سنتا۔ انسان فطرت سے اس لیے دُور ہو گیا ہے کہ اس کے پاس ذہن ہے۔ خبر نہیں یہ ذہن کہاں کہاں کی خاک چھنوائے گا؟"(۱۰)

پرندوں میں ناصر کاظمی کے پسندیدہ پرندے کبوتر اور چڑیاں۔ چڑیوں کا تعلق بھی ان کے بچپن سے جُڑا ملتا ہے۔ ان کے بچپن میں چڑیا صرف ایک پرندہ تھا لیکن بعد میں یہ پرندہ علامتوں میں ڈھل گیا اور معانی کے دفتر کھل گئے۔ ان کے کئی جذبات، احساسات، اداسی اور بدلتے زمانے کے اثرات کا اظہار اسی علامت میں

ہوا۔ کہیں چڑیوں کا شور ان کے رتجگوں پر غنودگی کا چھڑکاؤ کرتا ہے اور کہیں وہ چڑیوں کو اس دھرتی کے کردار گردانتے ہیں۔ چڑیا، ناصر کاظمی کا بچپن اور چڑیا کے علامتی مفہوم کے حوالے سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

> "بچپن میں چڑیوں کے گھونسلوں اور ان کے بچوں کے کھوج لگانے کا بڑا جنون تھا لیکن اس سے چڑیوں کو ستانا مقصود نہیں تھا بلکہ راجہ کے موتی چرانے والی چڑیا کی تلاش تھی اور اب تک ہے۔ بچے سکول میں کہتے۔۔۔ "آجا پیاری چڑیا آجا۔" اس وقت یہ چڑیا محض چڑیا تھی۔ پھر یہ چڑیا کئی روپ میں دیکھی۔ جب میں کالج کی چھٹیوں میں لاہور سے گھر واپس گیا تو اپنے محلے کی ایک گلی میں کئی دن تک اُداس پھرتا رہا۔ آخر ایک دن ایک آڑی نے مجھے بتایا کہ_ کہ وہ چڑیا اُڑ گئی۔ اس "وہ" کے لفظ نے بچپن کی ساری کہانیوں کو ایک نئے معنی پہنا دیے۔"(۱۱)

انتظار حسین نے اپنی ایک تحریر کا عنوان، "چڑیوں سے ناصر کاظمی کی آخری ملاقات" رکھا۔ اس عنوان سے ہی ناصر کاظمی کی چڑیوں سے محبت کا رشتہ جھلک رہا ہے۔ جیسے ایک آدمی دوسرے آدمی سے ملتا ہے، بات چیت کرتا ہے۔ اسی طرح ناصر پرندوں کے دوست ہیں۔ ان سے ہم کلام ہوتے ہیں۔ ہسپتال میں جب وہ اپنے آخری لمحات کاٹ رہے تھے۔ انھی لمحات میں انتظار حسین کو دیے گئے ایک انٹرویو میں درختوں اور چڑیوں کو اپنا سلام بھجواتے ہیں۔

> "ٹی وی والوں کے زیر اہتمام جب اس سے انٹرویو کیا گیا تو ساری باتیں کرنے کے بعد اس نے پیغام دیا کہ اس شہر کے درختوں اور چڑیوں کو میرا سلام کہنا۔ مگر چڑیوں کو آخری سلام اس نے کل جمعرات کی صبح کو کیا۔ ہسپتال میں پڑے ہوئے ناصر کاظمی کا یہ طریقہ تھا کہ جب رات کا کجرا ڈھلتا اور پو پھٹنے کے ساتھ چڑیاں بولتیں تو اپنے سرہانے کے قریب کے دریچے سے پردہ ہٹاتا اور چہکتی چڑیوں اور نکلتے سورج کا مشاہدہ کرتا۔"(۱۲)

ناصر کاظمی کے لیے دوسرا پرندہ جو بہت اہمیت کا حامل ہے وہ کبوتر ہے۔ انھیں بچپن سے کبوتر پکڑنے اور پالنے کا شوق تھا۔ انھوں نے کبوتر پکڑنے کا ہنر سیکھا جس کا ذکر انھوں نے انتظار حسین کے ساتھ مکالمے میں کیا۔

> "میں نے کبوتر پکڑنے کا ہنر سیکھا۔ اپنے کبوتروں کو مکان پر پھڑکیاں دیتا۔ دانا گراتا، پانی کی دھار اونچے سے گراتا کہ شاید اجنبی کبوتر بھوکا پیاسا ہو۔ اور اس طرح کبوتر میرے قابو میں آجاتا۔ لیکن بعض بعض کبوتر نہ بھوکا ہوتا نہ پیاسا۔ اسے پکڑنے کے لیے میں نے اپنے کبوتروں میں اتنا کس بل پیدا کیا کہ وہ ہر اڑنے والے دوسرے کبوتر کو اپنے ساتھ ملاتے اور کوٹھے کا چکر کاٹتے۔ اجنبی کبوتر تھک کر گر جاتا اور میں اسے پکڑ لیتا۔"(۱۳)

یہ اقتباس پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں کبوتروں کا شوق صرف یوں نہ تھا جیسے کسی کو بھی پرندوں سے رغبت ہوتی ہے بلکہ مکمل کبوتر بازی کے ہنر سے واقف تھے۔ اس مکالمے میں آگے ناصر کاظمی بتاتے ہیں کہ جنگلی کبوتر اور پالتو کبوتر کو ملانے سے جو بچے نکلتے ہیں وہ بہت پھرتیلے ہوتے ہیں، اچھی اُڑان بھرتے ہیں۔ مزید بتاتے ہیں کہ جنگلی اور پالتو کبوتروں کو ملا کر پیدا ہونے والے کبوتر جب اڑان بھرتے ہیں تو وہ جنگلی کبوتر پھانس کر لاتے ہیں۔ ناصر کاظمی کبوتروں پر بے لاگ اور کبوتر بازی کے حوالے سے معلومات سے بھرپور گفتگو کرتے۔ انھوں نے گھر میں کبوتر پالے۔ کبوتروں سے ان کی محبت کا یہ عالم تھا کہ ان کے مرنے پر کبوتر مضطرب تھے۔ کبوتروں کا اضطراب انتظار حسین نے دیکھا۔ وہ لکھتے ہیں :

> "اوپر کبوتر چکر کاٹ رہے تھے اور نیچے میت سج رہی تھی۔ میت اٹھنے کا وقت جوں جوں قریب آیا جاتا تھا کبوتروں کی پرواز میں اضطراب پیدا ہوتا جاتا تھا۔ ناصر کاظمی کی میت کبوتروں کے سائے میں گھر سے نکلی۔"(۱۴)

انتظار حسین نے ناصر کاظمی سے کبوتروں کے بارے میں بہت باتیں کیں اور ان باتوں کو مختلف تحریروں کا حصہ بنایا۔ انھوں نے ناصر کی باتوں سے اخذ کر کے یہ بیان بھی دیا کہ ان کا اصل خرچ تو کبوتروں کا ہے۔ کبوتروں کے خرچ میں انھوں نے نفع نقصان کی پرواہ کبھی نہ کی۔ انتظار حسین نے ایک کالم میں لکھا:

> "اس پر ناصر کاظمی بہت افسردہ ہوئے اور بولے کہ میری رائلٹی سے تو میرے کبوتروں کے دانے کا بھی خرچ پورا نہیں ہوتا اور ناصر کاظمی نے اپنے کبوتروں کے اخراجات گنائے۔ اس سے ہم نے یہ نتیجہ مرتب کیا کہ اس شاعر کا اصل خرچ کبوتروں کے دانے پانی کا خرچ ہے اور اگر اس نے ملازمت کر رکھی ہے تو اپنے کبوتروں کی خاطر کر رکھی ہے۔ بھوک تو آدمی کی تقدیر ہے۔ کبوتروں کو تو بھوکا نہیں رکھا جاسکتا۔"(۱۵)

انتظار حسین داستانوں سے، تہذیب سے، روایت اور قصے کہانیوں سے جُڑے ہوئے ادیب ہیں۔ اس لیے طلسمات کی دنیا سے ان کا واسطہ ہمیشہ رہا اور کوئی شخص ایسی فضا میں زیادہ دیر نہیں رہ سکتا اگر وہ اس کے موافق نہ ہو سو انتظار حسین کی اپنی تخلیقات اور مطالعے کی فضا کا طلسم تو اپنی جگہ قائم رہا۔ ساتھ ساتھ انھوں نے یاروں میں بھی ناصر کاظمی کی صورت میں ایک یار تلاش کر لیا جس کی باتوں میں، فرضی اور من گھڑت قصوں میں بلا کا علم پایا جاتا ہے۔ ناصر کاظمی کئی مبتلائے حیرت کرنے والے واقعات بہت آسانی اور روانی کے ساتھ بیان کرتے تھے۔ اُس آسانی اور روانی میں قابل ذکر چیز ان کی سنجیدگی ہے۔ اُن کی سنجیدگی کے پہلو میں بیان کا جادو پوشیدہ ہے۔ وہ من گھڑت واقعات کو ایسی متانت اور خود اعتمادی سے پیش کرتے ہیں

کہ سننے والے کے پاس اسے تسلیم کرنے اور حیران ہونے کے سوا کچھ نہیں بچتا۔ ان قصوں اور واقعات میں شیر کا قصہ، سانپ کا واقعہ، گھوڑوں کا واقعہ اور مزید کئی واقعات شامل ہیں۔ انتظار حسین جنھیں یہ بھی کہیں علم تھا کہ ناصر کاظمی کے قصوں اور واقعات کا تعلق حقیقت کے ساتھ کم کم ہے وہ ان قصوں سے لطف اندوز ہوتے۔ انھوں نے ناصر کے بیان کے جادو کو تو تسلیم کیا ہی مگر اپنے اولین مضامین میں سے ایک مضمون کے پہلی لائن میں ان کے مذکورہ مزاج کو "شیخی بگھارنا" سے تعبیر کرتے ہیں، اور اس سے محظوظ ہوتے ہیں۔ انتظار حسین کے مئی ۱۹۵۲ء کے مضمون سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

> "ناصر کاظمی یاروں میں بیٹھ کر ہی شیخی نہیں بگھارتا شعروں میں بھی شیخی بگھارتا ہے، لیجئیے مجھے ہنسی آگئی۔"(۱۶)

اس مزاج کو شیخی بگھارنا کہیں، بیان کا جادو کہیں یا ناصر کاظمی کی شخصیت کا علم کہیں، یہ ناصر کاظمی کا خاصا ہے۔ انتظار حسین اسی مضمون میں ایک واقعہ نقل کرتے ہیں:

> "اس کی باتیں سن کر مجھے اپنے بلند شہر کا ایک خانساماں اکثر یاد آیا ہے۔ یہ خانساماں بھی خوب چیز تھا۔ ادھر ادھر کی باتیں ہو رہی ہیں۔ کسی نے جنوں کا ذکر چھیڑ دیا۔ بھائی چل نکلے "میاں جنوں کی تو یَو سن لو کہ ایک دفعہ میں ۔۔۔۔۔" جنوں کا ذکر ہوتے ہوتے ذرا پٹڑی بدلی اور کسی کے منہ سے چور کا نام نکلا اور حضرت پھر بھڑکے "میاں چوروں کی تو سن لو کہ ایک دفعہ ہمارے محلہ میں۔۔۔۔۔۔" پھر باتوں باتوں میں کسی نے اگر سانپ کا نام لے دیا تو ایک داستان پھر حاضر ہے "میاں سانپ کی تو یو سن لو کہ ایک دفعہ ہمارے گھر میں ۔۔۔۔۔۔" مختصر یہ کہ خانساماں کیا تھا اچھا خاصا سند باد جہازی تھا۔ اور ہر داستان کے آخر میں اپنی فتح کا نقارہ بجاتا تھا۔ یوں جب سب ہنستے تھے تو وہ خود بھی ہنس پڑتا تھا مگر اسے اپنی سچائی میں شک کبھی نہیں ہوا۔ اس خانساماں اور ناصر کاظمی میں فرق صرف اتنا ہی ہے کہ ناصر کاظمی اس قدر سنجیدہ بن جاتا ہے اور اتنا جوش میں آجاتا ہے کہ چہرے پہ مسکراہٹ کے آثار دور دور تک دکھائی نہیں دیتے۔"(۱۷)

یہ مضمون ۱۹۵۲ء میں نقوش میں چھپا۔ یوں سمجھیے کہ انتظار حسین کے اولین مضامین میں سے ایک مضمون ہے اور یہ مضمون ناصر کاظمی کی شخصیت اور فن پر لکھے جانے والے مضامین میں بھی اولین حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ناصر کی شخصیت کے کئی گوشوں کو انتظار حسین نے ابتدا میں دریافت کر لیا تھا۔ "چار گھڑی یادوں کا میلہ" کے عنوان سے لکھے گئے مضمون میں انتظار حسین نے ناصر کے چند قصے درج کیے۔ اُن میں پہلا ایک بھڑ کا واقعہ ہے جو کھانے کے وقت ناصر کو تنگ کر رہی تھی۔ درخت پر

بیٹھے کوے نے یہ منظر دیکھا تو ناصر کے احترام میں شاخ سے اُڑا اور آ کر بھڑ کو چونچ میں لے اُڑا۔ اُس کے بعد ناصر کاظمی کی کوے سے یوں افہام و تفہیم ہوئی کہ ان کے کھانے کے وقت وہ شاخ پر مؤدب ہو کے بیٹھا رہتا ۔۱۸؎ شیر کی کہانی میں شیر سے دو مرتبہ ناصر کاظمی کی مڈھ بھیڑ ہوئی۔ ایک مرتبہ انھوں نے ببر شیر کو قیلولہ کی حالت میں پایا تو اُسے بے آرام نہ کیا۔ دوسری مرتبہ شیر نے اُنھیں دیکھ کر نظر نیچی کر لی ۔(۱۹)" بلی کبوتر کو دیکھ کر سہم گئی؟"۔ یاروں نے ناصر کاظمی کی زبان سے جب یہ جملہ سنا تو حیران ہوئے۔ تس پہ ناصر نے بہت دلچسپ توجیح پیش کی کہ اُنھوں نے ایک شیر مارا تو اس کی چربی میں دانہ ملا کر کبوتر کو کھلایا تو کبوتر شیر بن گیا ہے۔(۲۰) سانپوں کے قصے بھی ناصر کاظمی کی پنچ تنتر میں شامل تھے۔ بقول انتظار حسین اُن کی اپنی پنچ تنتر تھی۔(۲۱) اُنھوں نے سانپوں کے جو قصے سنائے اُن میں سانپ بڑے مردم شناس پیش کیے گئے۔ اُن کے باغ کے سانپ کسی غلط آدمی سے سودا ہونے پر پھن اٹھا کر کھڑے ہو جاتے اور وہ سودا ختم کر دیتے۔ بڑھیا کی کوٹھی کے ناگ کسی اجنبی کو کوٹھی میں قدم نہ رکھنے دیتے۔ اور تو اور کسی کے طنز کے جواب میں ناصر کاظمی نے تاؤ کھایا اور قصہ سنایا کہ ایک مرتبہ رات گئے گھر پہنچے تو سو رہے۔ صبح نیچے کوئی چیز سر سرائی۔ دری جو اٹھائی تو لمبا سانپ نکلا جس نے رات بھر انھیں کچھ نہ کہا۔(۲۲)

گزشتہ حوالوں میں بھڑ اور کوے، بلی اور کبوتر کے علاوہ شیر اور سانپوں کے قصے درج ہیں۔ یہ قصے ناصر نے جس قدر سنجیدگی سے سنائے انتظار حسین نے بیان کر دیے۔ ان محیر العقول قصوں اور واقعات کو پڑھ کر یوں لکھا جیسے کسی داستان کے حصے ہوں۔ انتظار حسین کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے جیتی جاگتی داستان کے داستانوی فضا سے معمور قصے ضائع نہ جانے دیے۔ انھوں نے ناصر کاظمی کے ساتھ رہتے ہوئے اور جانتے بوجھتے ہوئے ان کے طلسم کو ٹوٹنے نہ دیا بلکہ سنتے رہے۔ ذہن میں محفوظ کرتے رہے اور پھر اُنھیں لکھ ڈالا۔ جب کبھی ان کے طلسم کو کوئی توڑنے کی کوشش کرتا تو وہ فوراً بہت سنجیدگی کے ساتھ پانسا پلٹ دیتے۔

ناصر کاظمی انبالہ میں اصطبل اور باغوں کے قصے سناتے اور سننے والے دم بخود ہو کر سنتے رہتے لیکن ایک مرتبہ کوئی انبالہ سے ہجرت کر کے آ پہنچا اور اُس نے بتایا کہ ناصر کے خاندان کا کوئی اصطبل نہیں تھا تو انھوں نے بہت وقار اور اعتماد سے جواب دیا۔

> "یار بات یہ ہے کہ انبالہ کے لوگ بہت حاسد تھے۔ اس لیے ہم نے اپنا اصطبل شہر سے باہر بنایا تھا اور شہر والوں کو اپنے گھوڑوں کی بھی ہوا نہیں لگنے دی۔"(۲۳)

ان تمام قصوں کو ناصر کاظمی نے حقیقی واقعات کے طور پر پیش کیا۔ جب انھیں کہیں اپنے

واقعات کی حقیقت کے پاش پاش ہونے کا شائبہ گزرتا ہے تو اس وقت وہ فرار کے بجائے زیادہ سنجیدگی اور اعتماد سے کام لیتے ہیں اور صفائی سے نکل جاتے جیسے اصطبل والے حصے میں انھوں نے انبالہ کے لوگوں کو حاسد قرار دیا اور اپنا اصطبل وہاں سے اکھاڑ کر شہر سے باہر لے گئے۔ اپنے دادا کا قصہ انھوں نے سنایا کہ ایک دفعہ ان کے دادا کو غصہ آیا تو زلزلہ آگیا۔ (۲۴)

انتظار حسین کے ہاں ترقی پسند ادیبوں کی انسان دوستی اور محمد حسن عسکری کے پاکستانی ادب یا اسلامی ادب کے حوالے سے بیزاری پائی جاتی ہے۔ ان کے اندر کے ہیجان، اداسی کرب، یاد اور ہجرت کے زخموں کی وجہ سے پیدا ہونے والے سوالات کے جوابات ترقی پسند ادیبوں اور محمد حسن عسکری کے پاکستانی ادب میں نہ مل سکے یا کم از کم انتظار کی روح ان کے ان جوابات سے مطمئن نہ ہوئی۔ انھیں اطمینان صرف ناصر کاظمی کی صحبت میں ملا جس کا انھوں نے برملا اظہار کیا۔ اسے بھی ناصر کی شخصیت کا جادو کہیے کہ ان کا انتظار حسین جیسے نک چڑھے کو پہلی ملاقات میں اپنا گرویدہ بنالیا۔ وہ ناصر کے گرویدہ ان جذبات و احساسات کی سچائی کی وجہ سے ہوئے۔ انتظار حسین اپنے سوالات، اُن کی معنویت اور ناصر کی صحبت کی سحر انگیزی کے بارے میں یوں رقمطراز ہیں۔

> "یہ میرے سوالات تھے مگر ترقی پسند ادب اور اسلامی ادب کی بحثوں میں مجھے ان کی معنویت کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ ان کی معنویت کو میں نے ناصر کی صحبت میں بیٹھ کر جانا مگر ناصر موسم یاد کی اداس ہوا میں چلتا چلتا کہیں آگے نکل گیا تھا۔ اس نے اپنے اندر ایک باغ اگا لیا تھا۔ باہر کی ساری کمی اس اندر کے باغ میں پوری ہوگئی تھی۔ ناصر جب اس باغ کی سیر کراتا تو میرے اپنے سوال معطل ہو جاتے۔ ہم سب دوست کسی دوسری ہی دنیا میں پہنچ جاتے۔ کبھی کبھی ہم میں سے کوئی ایک حیرت کے ساتھ سوال کرتا مگر ناصر اس طرح وضاحت کرتا کہ اگر کسی دل میں کوئی تھوڑا بہت شک پیدا ہوتا تو وہ فوراً ہی زائل ہو جاتا۔"(۲۵)

اسی مضمون میں آگے انھوں نے لکھا:

> "آدھی رات ہوتے ہوتے سفید پوشوں کے ہوٹل اور ریستوراں بند ہو جاتے۔ دکانیں بند، بازار خالی۔ فٹ پاتھوں کا نقشہ یہ نظر آتا کہ جہاں تہاں کوئی گدڑی پوش گڑمڑی مارے پڑا ہے یا گھٹنوں میں سر دیے خاموش بیٹھا ہے۔ کسی نکڑ پہ کسی بوڑھے قسمت کے مارے پنواڑی نے اپنی بساط جما رکھی ہے۔ کسی کھمبے تلے فٹ پاتھ پہ چائے کی دکان جمی ہے۔ اس خاک میں رلی ملی مخلوق سے ناصر کا جیتا جاگتا تعلق تھا۔ اس مخلوق میں ہر قماش کے آدمی سے مڈھ بھیڑ ہوتی۔"(۲۶)

گدڑی پوشوں، خاک نشینوں یا خاک میں رلی ملی مخلوق سے ناصر کاظمی کا گھلنا ملنا ہی انتظار حسین کے سوالات کا اطمینان بخش جواب ٹھہرا کیوں کہ یہ انسان دوستی کی عملی شکل تھی۔

ناصر کاظمی کا عام لوگوں کے ساتھ دوستانہ تھا۔ تانگے والے رات کے ڈیڑھ، دو حتی کہ تین بجے تک ٹولنٹن مارکیٹ کے نکڑ پر ان کا انتظار کرتے۔ ناصر کے حلقہ ارادت میں کوئی ایک تانگے والا نہ رہا تھا۔ دو تین رہے۔ جو بھی تانگہ بان ان کی اسیری میں آیا وہ سود و زیاں سے بے نیاز ٹولنٹن مارکیٹ کے کونے میں ان کا انتظار کیا کرتا۔ اس دوران اگر انھیں کوئی اور سواری ملتی تو وہ صاف انکار کر دیتے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب تانگہ بانوں کو بھی شاعری سے شغف تھا۔ ان میں سے ایک تو شاعری کا ایسا دیوانہ نکلا کہ ناصر کاظمی سے شعر سنا اور پھر تادم آخر انہیں مفت لے جانے کا وعدہ کیا۔ اس بات سے ادب کے مرکز شہر لاہور کی تہذیب کا اندازہ ہوتا ہے جہاں ادب کا بول بالا رہا۔ یونہی تو نہیں ناصر کاظمی نے لاہور شہر کو شاعروں کا شہر کہا۔ میر ٹھی تانگے والے سے ناصر کاظمی کے تعلق کی بنیاد ایک شعر بنا۔

> "تانگے والا مرحوم میر ٹھی مر گیا بابا۔ اس سے میری دوستی کی بنیاد ہی یہی تھی کہ ایک دن بارش ہو رہی تھی۔ اس سے کہا کہ تانگہ بھٹی لے چلو گے گھر میرے کرشن نگر۔ اس نے کہا کہ نہیں صاحب۔ میں نے کہا بھئی چلو۔ کہنے لگا کہ میں نے بڑی بڑی سواریوں کو انکار کیا اس بارش میں، اس برکھا میں کون جائے گا تو میں نے کہا بھائی میں شعر کہتا ہوں۔ کہنے لگا کوئی شعر سناؤ۔ تو جب میں نے یہ شعر سنایا کہ....
>
> واقعہ یہ ہے کہ بدنام ہوئے بات اتنی تھی کہ آنسو نکلا
>
> تو وہ بڈھا باہر بارش میں بھیگتا بھیگتا تانگے سے اچھل پڑا۔ کہنے لگا ابے لونڈے تیرا یہ شعر ہے۔ آ بیٹھ تانگے میں اور ساری عمر مفت لے جاؤں گا اور تادم آخر وہ مجھے لے جاتا رہا۔"(۲۷)

ناصر کاظمی کے تانگہ بان دوستوں میں جالندھری، لئیق اور میر ٹھی شامل ہیں۔ زمانے نے ترقی کی سڑکوں پر گاڑیوں کی ریل پیل شروع ہوئی تو تہذیب کا قتل عام ہونے لگا۔ تانگے چلانے والے ٹیکسیاں خریدنے پر مجبور ہو گئے۔ ناصر کے ارادت مندوں نے بھی ٹیکسیاں چلانا شروع کر دیں۔ ایسے لوگوں سے ان کی دوستی ہمیشہ رہی۔ تانگہ بان، پنواڑی، ریستورانوں کے بیرے اور ٹیکسیوں کے ڈرائیور سب ان کے چاہنے والے، ان کے یار بیلی تھے۔ جب انتظار حسین نے ایسی مخلوق کو ان کے ہم عصر کہہ کر ان کے بارے میں دریافت کیا تو بتانے لگے۔

"صاحب! تعلق تو میرا اب بھی ان سے ہے۔ ابھی ابھی پرسوں مجھے ہسپتال میں ٹیکسی والوں کا ایک وفد ملنے آیا۔ کہنے لگا صاحب اخبار میں پڑھا کہ آپ کو طبی امداد میں کچھ کمی ہے۔ کچھ دقت ہے تو یہ لیجیے ہم کچھ اکٹھا کر کے لائے ہیں۔ میں نے کہا کہ نہیں۔"(۲۸)

ناصر کاظمی مرعوب کرنے کی صلاحیت سے مالا مال تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پڑھے لکھے، استاد، فلسفی، کالجوں، یونیورسٹیوں کے طالب علم، نو آموز شاعر، تانگہ بان، پنواڑی اور ریستورانوں کے بیروں سے لے کر خاک میں خاک ہوئے لوگ بھی ان کا دم بھرتے۔ ان کا انتظار کرتے اور ان سے اپنا گہرا یارانہ ظاہر کرنے میں فخر محسوس کرتے۔ ناصر کاظمی کے ہم عصر انتظار حسین نے گنوائے۔ سہیل احمد خان نے اپنے مضمون میں سرسوں کے پھول کو ان کا ہم عصر کہا لیکن میں یہاں کہوں گا کہ ان سب ہم عصروں کے ساتھ ساتھ کلیات میرؔ بھی گویا ان کی ہم عصر ٹھہری۔ میر کے بے شمار شعر انھیں یاد تھے اور بر محل انگڑائی لے کر زبان پر آجاتے۔ وہ میر کا بہت ذکر کرتے۔ میر کو ان کے والد نے عشق کرنے کا کہا تو ناصر کاظمی کو ان کی والدہ نے میرؔ پڑھنے کو کہا۔ انتظار حسین نے جہاں ناصر کے انار کلی والے مکان کا نقشہ پیش کیا وہاں اس کے مشمولات کے حوالے سے یوں رقم طراز ہوئے۔

" ساز و سامان کے نام کچھ کتابیں کچھ کاغذ جہاں تہاں بکھرے ہوئے۔ ایک پلنگ اور ایک تتر بتر بستر۔ "کلیات میر" اس بستر کا تکیہ تھا۔۔۔ میر متقی نے بیٹے سے کہا کہ اے فرزند عشق کیا کر۔ ناصر کی والدہ صاحبہ نے ناصر کو نصیحت کی کہ بیٹے میر کو پڑھا کرو۔ میر کے ذکر سے تنگ آکر ایک روز میں نے ناصر سے انیس کے بارے میں پوچھا۔ کہنے لگا میری والدہ نے بچپن ہی میں مجھے سارا انیس پڑھا دیا تھا۔"(۲۹)

میر تقی میر ناصر کاظمی کا ہمیشہ اوڑھنا بچھونا رہے۔ وہ اپنے عالم فاضل دوستوں سے پہروں میر پر بات کرتے۔ میر تقی میر پر اب تک سینکڑوں کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔ انھیں بہت پڑھا گیا لیکن یہ بات ناصر کاظمی پر صادق آتی ہے کہ انھوں نے میر کی شاعری کو بسر کیا۔ میر کے اشعار میں جیون گزارا۔ وہ میر کے عشق میں مبتلا رہے۔ ان کے اشعار سے طرح طرح کی رمزیں نکال لاتے۔ ناصر نے انتظار حسین اور دوسرے ادیبوں کے ساتھ مکالموں میں میر تقی میر پر بہت بحثیں کیں۔ ان کے اشعار کی تفہیم پہ طویل نشستیں کیں۔ ایک مکالمے میں کہتے ہیں :

"کلیات میر کے کچھ حصے کو میں میر کا روز نامچہ بھی سمجھتا ہوں۔ میر نے لسانیات کے سلسلے میں جو کام کیا ہے وہ بھی اسی میں موجود ہے۔ غالباً میر سب سے پہلا شاعر ہے جس نے اُردو

میں سب سے پہلے فن تنقید کو شعر کے رستے سے رائج کیا۔ اُس کے اس نوع کے اشعار پر تعلّی کا الزام لگایا جاتا ہے۔ یہ بات یوں ہے کہ اچھا شاعر پہلے نقاد بھی ہوتا ہے۔"(۳۰)

میر کے حوالے سے ایسی رائے غالباً پہلی بار ہی دی جا رہی تھی۔ ناصر کاظمی نہ صرف خود میر کی شاعری کو بسر کرتے بلکہ وہ اپنے دوستوں سے بھی میر کی شاعری سن کر ویسے ہی جذبات کی توقع رکھتے۔ انتظار حسین نے لکھا:

"جو شخص میر کے شعر پر بے ساختہ داد نہیں دے سکتا اسے کاظمی کم از کم پاکستان میں جینے کا حق تو نہیں دے سکتا۔"(۳۱)

ناصر کاظمی صرف میر کو نہ پڑھتے بلکہ ان کے علاوہ بھی صفِ اول کے شعرا ان کے مطالعے میں رہتے۔ وہ شاعری کے علاوہ دوسرے فنون پر کتب کا مطالعہ کرتے۔ فلسفہ کے بارے میں علم رکھتے تھے لیکن علمی بوجھل پن کے قائل کبھی نہ رہے۔ مکالمے میں بہت دلچسپی لیتے۔ پڑھے لکھے لوگوں کے ساتھ چائے خانوں کے میزوں پر بیٹھے پہروں بحث کرتے جس سے بعض لوگوں کو یہ شائبہ بھی ہوا کہ ان کا سارا علم سماعی ہے لیکن ایسا نہیں۔ انھوں نے خود ایک شام شک کرنے والوں کے لیے اعلان کیا :

"میں ڈاکو ہوں۔"

"ڈاکو؟" یاروں نے حیرت سے ناصر کو دیکھا۔

"ہاں ڈاکو!" ناصر نے کہا "بات یہ ہے کہ دو ٹکے کے چور یہ کرتے ہیں کہ گھر کے ایک ایک کمرے کو ٹٹولتے ہیں اور سارا مال و اسباب ڈھونے کی کوشش کرتے ہیں۔ بڑے ڈاکو یہ نہیں کرتے۔ وہ سیدھے اس کمرے میں جاتے ہیں جہاں سیف رکھا ہے اور مالک کنجیاں دبائے سو رہا ہے۔ مالک کے سینے پر پستول رکھ کے کنجیاں رکھوائیں، سیف کھولا، زر و جواہر نکالے اور باقی ساز و سامان کو دیکھے بغیر یہ جا وہ جا۔ میں بھی کتاب کے اندر ایسے داخل ہوتا ہوں جیسے ڈاکو کسی حویلی میں داخل ہوتا ہے۔"(۳۲)

ناصر کاظمی کو علم سے رغبت تھی۔ وہ ان شاعروں میں سے نہ تھے جو چائے کی میز پہ محفل تو جمائے رکھتے ہیں لیکن علم کی بات ان کو بوجھ محسوس ہوتی ہے۔ ناصر کے ہاں علم کی طلب ہمیشہ رہی یہی وجہ ہے کہ عالم فاضل لوگوں سے ان کا یارانہ رہا۔

ناصر کاظمی کی شاعری، ان کی گفتگو اور ان کی شخصی زندگی میں رات کو بہت اہمیت حاصل رہی۔ رات ان کی دوست رہی۔ انھوں نے سب سے زیادہ وقت رات کے ساتھ گزارا۔ ان کے رتجگوں کی گواہی ان کے عہد کے تمام دوستوں کی تحریروں میں ملتی ہے۔

رات ان کے ہاں صرف رات نہیں رہتی وہ کئی روپ دھار لیتی ہے۔ رات ان کے لیے تخلیق کی علامت ہے۔ رات جادو بھی ہے، اداسی بھی لے کر آتی ہے، آوارگی کا وقت بھی ہے۔ اس طرح کئی وابستگیاں اُن کی رات کے ساتھ ہیں سو وہ رات چھت کے نیچے گزارنے کو اُسے ضائع کرنے سے تعبیر کرتے ہیں۔ اگر اس تناظر میں دیکھیں تو انھوں نے اپنی رات شاید ہی کبھی ضائع کی ہو۔ رات جوں جوں بڑھتی جاتی ناصر کی آنکھوں میں چمک بڑھتی جاتی اور اُن کی آواز کی کھنک میں اضافہ ہوتا جاتا۔ پھر آذان ہوتی یا چڑیاں بولنے لگتیں تو ان کی آواز میں غنودگی آنے لگتی۔ انتظار حسین کو انٹرویو دیتے ہوئے وہ کہتے ہیں :

"یہ طلوع و غروب، اصل میں رات میری شاعری میں بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اس کی وجہ، رات اندھیری رات نہیں یا وہ جسے ہمارے جدید شاعر ایک تاریکی کا استعارہ کہتے ہیں۔ رات تخلیق کی علامت ہے۔ دنیا کی ہر چیز رات میں تخلیق ہوتی ہے۔ پھولوں میں رس پڑتا ہے رات کو، سمندروں میں تموج ہوتا ہے رات کو، خوشبوئیں رات کو جنم لیتی ہیں حتی کہ فجر تک ، فرشتے رات کو اترتے ہیں۔ سب سے بڑی وحی بھی رات کو نازل ہوئی ۔"(۳۳)

رات کے ایک بجے ناصر کی آنکھیں کھلنا شروع ہوتیں۔ ٹی ہاؤس رات گیارہ بجے تک کھلا ہوتا۔ اُس کے بعد وہ مال روڈ کے دوسرے ریستورانوں کا رخ کرتے وہ بھی بارہ بجے بند ہو جاتے تو کسی اور شاہراہ پر نکل کھڑے ہوتے۔ اُس وقت انتظار حسین نے اگر گھر چلنے کی بات کی تو ناصر انھیں گھور کر دیکھتے اور کہتے۔ "اب تو میری آنکھیں کھلنی شروع ہوئی ہیں۔"(۳۴)

اکتوبر ۱۹۵۸ء تک ان کے ہاں رات کا تصور الگ ہے، اس کی معنویت اور علامتی اظہار بھی الگ ہے لیکن اس کے بعد ان کی راتوں کو خوف نے آلیا۔ خوف کے ساتھ ساتھ ویرانی، اجاڑپن اور آسیب راتوں میں در آئے۔ یہ مارشل لاء کا زمانہ ہے۔ اس مارشل لاء نے ناصر اور ان کے ساتھیوں کی راتوں پہ ڈاکہ ڈال لیا۔ ان کے ہاں شاعری میں رات کے مفہوم بدل گئے۔ پھر وہ راتیں تاریک راتیں ہی بن گئیں۔ راتیں خوف زدہ ہو گئیں جیسے انہیں نظر لگ گئی ہو۔ انتظار حسین لکھتے ہیں :

"رات کا وہ جادو جو ناصر کی معرفت ہم پر منکشف ہوا تھا، زائل ہو چلا تھا۔ اب رات کی تہہ میں خوف کی ایک مبہم سی اور سرسراتی موجودگی محسوس ہوتی تھی۔ ناصر نے رات کی حمد و ثنا ترک کر دی تھی۔ اب اس کے یہاں رات کے بیان نے یہ رنگ اختیار کر لیا تھا:

کیسی اندھیری رات ہے دیکھو اپنے آپ سے ڈر لگتا ہے

بازار بند، راستے سنسان و بے چراغ
وہ رات ہے کہ گھر سے نکلتا نہیں کوئی
گلیوں میں اب تو شام سے پھرتے ہیں پہرہ دار
ہے کوئی کوئی شمع سو وہ بھی بجھی ہوئی

ہماری راتیں زوال کرتی چلی گئیں اور ناصر کے رتجگے پریشان ہوتے چلے گئے۔" (۳۵)

ناصر کاظمی کے ہاں رات پہلے بھی اداسی اپنے ساتھ رکھتی تھی لیکن ۱۹۵۸ء کی اُن راتوں میں اپنے آپ سے ڈر لگنے لگا۔ جہاں راتوں کو ادیب آوارگی کرتے وہاں پہرے دار گھومنے لگے۔ راتیں پر ہول ہو گئیں یعنی راتوں کو اکٹھے ہونے والوں کی راتیں اجڑ گئیں۔

ناصر کاظمی جن کی زندگی رومانوں، قصوں، بحث مباحثوں اور جگراتوں سے بھری ہوئی ہے ان کی شادی کا قصہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ انتظار حسین نے جیسے ناصر کی بہت باتوں کو کہیں شیخی بگھارنے کا نام دیا تو کہیں ان کی شخصیت کا طلسم کہا۔ سو ایک دن جب ناصر کاظمی نے اپنی شادی کا کہا تو انھیں دل سے یقین نہ آیا مگر منہ پہ انکار نہ کیا اور شادی میں شریک ہونے کی حامی بھر لی۔ احمد مشتاق براتیوں اور ولیمہ کے مدعوعین کی فہرستیں بنانے لگے۔ عمائدین شہر کے نام لکھے گئے اور پھر ایک دن احمد مشتاق اور ان کی بنائی گئی فہرستوں کو چھوڑ کر برات منٹگمری جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ انتظار حسین اور چند ایک ساتھی پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھے انتظار کر رہے اور ناصر غائب۔ ان کے بھائی انھیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں کہ وہ اُنھیں ایک پنواڑی کے پاس بیٹھے ملے۔(۳۶)

ناصر کاظمی کے مداحوں نے انھیں ہمیشہ اپنی ذات میں گم پایا اور شاعری کو بسر کرتے ہوئے پایا۔ وہ ناصر کاظمی کی شخصیت اسی رومان بھری فضا میں دیکھتے اور ہمیشہ دیکھنا چاہتے تھے یہی وجہ ہے کہ جب انھیں ناصر کی شادی کا علم ہوا تو وہ برہم ہوئے۔ اُنھیں اس بات پر غصہ آیا کہ اب شادی کے بعد ان کی محبوب شخصیت کا طلسم ختم ہو جائے اور جذباتی مداحین نے شاعر ناصر کے مر جانے کا اعلان کر دیا۔ "اچانک ایک مداح نے کافی ہاؤس میں بیٹھے بیٹھے اعلان کیا کہ ناصر مر گیا۔" کیا بکواس کرتے ہو۔ "ناصر جو شاعر تھا وہ تو مر گیا۔ اب اس طرف سے کوئی غزل نہیں آئے گی۔ "مایوس مداحوں کو فوراً ہی اس بات کا یقین آ گیا۔ اب جسے دیکھو کہہ رہا ہے کہ یار شاعر مر گیا۔ اب ناصر شعر نہیں کہہ سکتا۔ ناصر کا ان دنوں کافی ہاؤس اور ٹی ہاؤس میں آنا جانا بھی کم ہو گیا تھا۔ ہم جان کر اس کی طرف نہیں جاتے تھے کہ اس کے ہنی مون میں کھنڈت نہیں پڑنی

چاہیے۔ مگر اسی ہنگام جب شاعر کے مرنے کا چرچا ہو رہا تھا اچانک وہ ایک شام ٹی ہاؤس میں داخل ہوا اور مژدہ سنایا کہ غزل ہوئی ہے۔

کچھ تو احساس زیاں تھا پہلے　　دل کا یہ حال کہاں تھا پہلے

ایک دم سے یار و اغیار سب کے منہ بند ہو گئے۔ شاعر کی بحالی ہو گئی۔(۳۷)

شادی کے بعد ناصر کاظمی دوبارہ رومانوں بھری شخصیت کے ساتھ نمودار ہوئے۔ جب یہ کہا گیا کہ ناصر کاظمی کی شاعری کی بسنت گزر گئی تو گویا انھوں نے یہ بات سن لی اور شادی کے اگلے ہی روز اٹھارہ اشعار پر مشتمل نئی غزل لکھ کر وارد ہوئے اور کہنے لگے "آپ خود فیصلہ کر لیں کہ میں مر چکا ہوں یا زندہ ہوں۔"(۳۸)

اس سے قبل "چراغوں کا دھواں" میں ایک غزل کی طرف اشارہ ملا اور اب ۲۰ جنوری ۱۹۶۴ء کے ایک کالم میں اٹھارہ اشعار کی غزل کا حوالہ ہے۔ ان حوالوں سے غزل کا سراغ لگانے میں آسانی ہوئی۔ مذکورہ غزل کے کچھ شعر دیکھیے:

کچھ تو احساس زیاں تھا پہلے
دل کا یہ حال کہاں تھا پہلے
ڈیرے ڈالے ہیں بگولوں نے جہاں
اُس طرف چشمہ رواں تھا پہلے
ہر خرابہ یہ صدا دیتا ہے
میں بھی آباد مکاں تھا پہلے
ہم نے آباد کیا ملکِ سخن
کیا سنسان سماں تھا پہلے
غم نے پھر دل کو جگایا ناصر
خانہ برباد کہاں تھا پہلے(۳۹)

درج شدہ منتخب اشعار میں تیسرا شعر دیکھیں تو شاعر نے شاعرانہ تعلی سے کام لیا ہے۔ عین ممکن ہے یہ تعلی کا استعمال بھی مذکورہ مداحین کی بدگمانی کا ردعمل ہو۔ بہ ہر حال ناصر کاظمی نے اس غزل میں ثابت کیا کہ وہ اپنے احساسات و جذبات کے ساتھ اپنے تخلیقی عمل کے وقار کے ساتھ زندہ ہیں۔

انتظار حسین نے ناصر کاظمی کی شخصیت اور فن پر جتنا لکھا اس کے مکمل مطالعہ کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ان کی ہشت پہلو شخصیت پر صرف انتظار حسین جیسا مشاہدہ کار اور قلم پر کامل گرفت رکھنے والا لکھاری ہی انصاف کر سکتا تھا اور انھوں نے کیا بھی۔

بیسویں صدی کے نصف اول کے آخر میں دونوں کی ملاقات ہوئی۔ نصف آخر کے آغاز میں انتظار حسین نے ناصر پہ اولین تحریریں لکھیں اور اس کے بعد مسلسل لکھا۔ آج بھی ناصر کے فن اور شخصیت پر لکھے گئے خاکے، سوانحی مضامین اور تنقیدی مضامین کا مطالعہ کریں تو کوئی تحریر بھی انتظار کے اثر سے محفوظ نہ رہ سکی۔

☆☆☆☆☆

حوالے

(۱) انتظار حسین، "چار گھڑی یادوں کا میلہ "مشمولہ ہجر کی رات کا ستارہ، مرتبین: احمد مشتاق، باصر سلطان کاظمی (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳)، ۲۱۔

(۲) انتظار حسین، چراغوں کا دھواں، (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۸)، ۲۹۔

(۳) انتظار حسین، چار گھڑی یادوں کا میلہ، ۲۶۔

(۴) انتظار حسین، چراغوں کا دھواں، ۱۰۶۔

(۵) انتظار حسین، چار گھڑی یادوں کا میلہ، ۲۲۔

(۶) انتظار حسین، ناصر کاظمی کے ساتھ گفتگو، مشمولہ ہجر کی رات کا ستارہ، مرتبین: احمد مشتاق، باصر سلطان کاظمی (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳)، ۱۶۶۔

(۷) انتظار حسین، ناصر کاظمی کے ساتھ گفتگو، ۱۶۵۔

(۸) ناصر کاظمی، انتظار حسین مکالمہ نیا اسم، مشمولہ خشک چشمے کے کنارے (لاہور: القا پبلی کیشنز، ۲۰۱۶)، ۱۲۸۲

(۹) ناصر کاظمی، دیوان (لاہور: القا پبلی کیشنز، ۲۰۱۶)، ۳۹۔

(۱۰) ناصر کاظمی، انتظار حسین، مکالمہ (نیلا اسم)، ۲۸۳۔

(۱۱) ناصر کاظمی، انتظار حسین، مکالمہ (افسانہ نگار کی تلاش) مشمولہ خشک چشمے کے کنارے (لاہور: القا پبلی کیشنز، ۲۰۱۶)، ۲۶۹۔

(۱۲) انتظار حسین، چڑیوں سے ناصر کاظمی کی آخری ملاقات، مشمولہ ملاقاتیں (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۱۳)، ۲۹۹۔

(۱۳) انتظار حسین، ناصر کاظمی "دھواں سا ہے کچھ اس نگر کی طرف "مشمولہ خشک چشمے کے کنارے (لاہور: القا پبلی کیشنز، ۲۰۱۶)، ۲۶۰۔

(۱۴) انتظار حسین، چڑیوں سے ناصر کاظمی کی آخری ملاقات، ۲۹۹۔

(۱۵) انتظار حسین، کالم مشمولہ بوند بوند (لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز، ۲۰۰۴ء)، ۱۳۴۔

(۱۶) انتظار حسین، "آنکھ رکھتا ہے تو پہچان مجھے"، نقوش، شمارہ ۲۲-۲۱ (۱۹۵۲ء)، ۱۶۶۔

(۱۷) انتظار حسین، آنکھ رکھتا ہے تو پہچان مجھے، ۱۶۷۔

(۱۸) انتظار حسین، چار گھڑی یادوں کا میلہ، ۲۳-۲۴۔

(۱۹) ایضاً،۲۴۔ (۲۰) ایضاً،۲۴۔ (۲۱) ایضاً،۲۴۔

(۲۲) ایضاً،۲۵۔ (۲۳) ایضاً،۲۴-۲۵۔

(۲۴) انتظار حسین،بوند بوند،۹۸۔

(۲۵) انتظار حسین، چار گھڑی یادوں کا میلہ،۲۳۔

(۲۶) ایضاً،۳۶۔

(۲۷) انتظار حسین،ناصر کاظمی کے ساتھ گفتگو،۱۷۴۔

(۲۸) ایضاً،۱۷۴۔

(۲۹) انتظار حسین، چار گھڑی یادوں کا میلہ،۲۸۔۲۷۔

(۳۰) انتظار حسین،ناصر کاظمی،دھواں ساہے کچھ اس نگر کی طرف،۲۶۴۔

(۳۱) انتظار حسین، آنکھ رکھتا ہے تو پہچان مجھے، ۱۷۰۔

(۳۲) انتظار حسین،چار گھڑی یادوں کا میلہ" ،۳۰۔

(۳۳) انتظار حسین، ناصر کاظمی کے ساتھ گفتگو،۱۶۷۔

(۳۴) انتظار حسین،جستجو کیا ہے،(لاہور:سنگ میل پبلی کیشنز،۲۰۱۱)،۱۱۲۔

(۳۵) انتظار حسین،چار گھڑی یادوں کا میلہ،۴۰۔

(۳۶) انتظار حسین، چراغوں کا دھواں،۱۰۵۔

(۳۷) انتظار حسین، چراغوں کا دھواں،۱۰۵۔

(۳۸) انتظار حسین،بوند بوند،۲۲۔

(۳۹) ناصر کاظمی،برگ نے،(لاہور:الفا پبلیکیشنز،۲۰۱۶ء)،۱۵۶،۱۵۵،۱۵۴،۱۵۳۔

Bibliography

- Intizar Hussain, Char Ghari Yadoon ka maila, (Incl.) *Hijar ki Raat ka Sitara*, (Comp.) Ahmad Mushtq/ Basir Sultan Kazmi, (Lahore: Sang-e Meel Publications, 2013)
- Intizar Hussain, *Charaghon ka dhowan*, (Lahore: Sang-e Meel Publications, 2008)
- Intizar Hussain, Ankh Rakhta hai tu Pehchan Mujh, (Incl.) *Naqoosh*, Lahore, 2009.
- Intizar Hussain, Calum, (Incl.) *Boond Boond*, (Lahore: Sang-e Meel Publications, 2004)
- Intizar Hussain, Chriyon sy Nasir Kazmi ki Aakhri Mulaqat, (Incl.) *Mulaqateen*, (Lahore: Sang-e Meel Publications, 2013)
- Nasir Kazmi, *Barg-e Ny*, (Lahore: Alqa publications, 2016).
- Nasir Kazmi, Intizar Hussain Muqalma Nia Ism, (Incl.) *Khushk Chashmy k Kinary*, (Lahore: Alqa Publications, 2016)

❖❖❖